محمد جعفر پھلواروی

اسلام اور فطرت

(سلسلہ کے لیے دیکھئے ثقافت مئی ۱۹۶۳ء)

چند اوامر و نواہی اور فطرت

علمائے دین نے دین کے چار بڑے حصے کیے ہیں:

(۱) عقائد یعنی ایسے حقائق جن کو بغیر کسی شبہ و شک کے پورے یقین کے ساتھ مان لیا جائے اور پورے نظامِ زندگی کی عمارت انھی بنیادوں پر قائم کی جائے۔

(۲) عبادات (مناسک) چند ایسے مراسم پرستش جن سے یہ اظہار ہو سکے کہ ان عقائد پر واقعی ایمان ہے۔ (اس کے لیے عبادات کی بجائے مناسک کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ "عبادت" کا تعلق پورے نظامِ زندگی سے ہے نہ کہ فقط مراسم پرستش سے)

(۳) اخلاق۔ انفرادی و اجتماعی کردار و سیرت۔

(۴) معاملات۔ دوسروں سے برتاؤ اور باہمی روابط۔

یہ چاروں اجزا ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ و پیوستہ اور ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہیں کہ ان کا الگ الگ تصور قائم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ہر ایک کا مقام، باہم پیوستہ ہونے کے باوجود، جدا جدا بھی ہے، قریباً اسی طرح جس طرح ایک درخت کے مختلف اجزا مثلاً جڑ، تنہ شاخیں اور برگ و بار، ہوتے ہیں یا ایک انسان کے اندر دل، دماغ، معدہ، پھیپھڑہ، خون وغیرہ ہوتے ہیں جو اپنی علاحدہ علاحدہ انفرادیت بھی رکھتے ہیں اور اس کے باوجود ایک دوسرے کے بغیر بے کار بھی ہیں۔

اسلام کے یہ چاروں اجزا جداگانہ نوعیتوں سے فطرت کے عین مطابق ہیں۔ عقائد اور

مناسک پر بحث اس وقت میرے موضوع میں داخل نہیں۔ صرف اخلاق و معاملات کی وہ مثالیں پیش کرنی مقصود ہیں جو عین فطرت کے مطابق ہیں۔ ان میں بھی فقط چند ـــــ تاہم مختصراً اتنا بھر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ عقائد و مناسک بھی عین مطابقِ فطرت ہیں۔ نادیدہ حقیقتوں پر غائبانہ ایمان لے آنا کس انسان کی فطرت میں موجود نہیں۔ اگر ہمارے یقین و ایمان کا جائزہ لیا جائے تو اس کا تین چوتھائی حصہ ایسا نکلے گا جس پر ہمارا ایمان تحقیقی نہیں تقلیدی ہے اور مشاہداتی نہیں غائبانہ ہے۔ جس فن کا ہمیں تجربی علم نہیں ہوتا اس کے بیان کردہ رموز کو ہم صرف اس لیے مان لیتے ہیں کہ اس فن کا فلاں ماہر یوں کہتا ہے یا اس نے ایسا لکھا ہے حالانکہ بارہا یہ بھی تجربہ ہو چکا ہے کہ بعض فن کے ماہرین کے فلاں فلاں نظریے غلط بھی ثابت ہوتے ہیں، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غلط بھی کسی وقت غلط ہو جائے۔ پھر وہ ایمان بالغیب کیونکر خلافِ فطرت تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کا معلّم ایک سچا، دانا، بے غرض، پختہ کردار ـــــ رسول و نبی ـــــ ہو اور اپنے معاملے کو شک و شبہہ کے ساتھ نہیں بلکہ پورے جزم و یقین کے ساتھ، اور کسی مغالطۂ فہم کی وجہ سے نہیں بلکہ پورے شعور و دانست کے ساتھ، اور رواروی میں وقتی طور پر نہیں بلکہ ساری عمر بار بار کی تکرار کے ساتھ پیش کرے اور بڑی سے بڑی آزمائش بھی اسے اس کے اظہار سے نہ ہٹا سکے۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس نے اپنے پیش کردہ حقائق میں کبھی کسی مصلحت سے ادنیٰ سے ادنیٰ ترمیم بھی نہ کی ہو اور پھر اسی حقیقت کو ہزاروں ویسے ہی سچے، عاقل، بے لوث اور پختہ سیرت انسان (انبیاء) بھی کہہ چکے ہوں۔ (اور کروڑوں بلند انسانوں نے بعد میں بھی تسلیم کر لیا ہو)؟ فرمائیے ایسی حقیقت کو ذاتی مشاہدے کے بغیر اگر ایک انسانِ کامل پر اعتماد کر کے مان لیا جائے تو یہ ایمانِ غائبانہ فطرت کے خلاف ہوگا یا عین فطرت؟ ہم میں کتنے ہیں جنھوں نے ایٹم یا امیبا یا دوسرے جراثیم کو بچشمِ خود خُردبین سے دیکھا ہے؟ کس کس نے الیکٹرون، نیوٹرون اور پروٹون کی عجیب الحرکت گردشوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے اور کون کون سے اہلِ علم محقق ہیں جنھوں نے ایتھر کو اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح اس کے دریافت کرنے والوں نے کیا ہے؟ اگر ان چیزوں پر ایمان بالغیب

لایا جاسکتا ہے اور یہ ایمان فطرت کے خلاف نہیں ـــــ دراں حالیکہ ان نظریات میں آئندہ بہتری ترمیمات بھی متوقع ہیں ـــــ تو ان انبیاء کے پیش کردہ تصورات پر ایمان لانا کیوں خلافِ فطرت ہوگا جن کی سیرت، دماغ، قوتِ فکر، ذریعۂ علم ہر چیز بلند تر سطح پر متمکن ہے اور بے داغ ہے؟

ایمان بالغیب یعنی غائبانہ یقین کی حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد اس کے مطابق "مناسک" کا ادا ہونا بھی عین فطرت ہے۔ کسی ریاست کی وفاداری کا اظہار اس کے جھنڈے کو سلامی دے کر ہوتا ہے حالانکہ اہلِ ریاست کے مسائلِ زندگی کا اس رسم سے کوئی تعلق نہیں۔ محبت کا اظہار جان و مال، وقت اور دوسری متاعِ عزیز کے ایثار سے ہوتا ہے، حالانکہ اگر یہ نہ کیا جائے تو محبت میں کوئی کمی نہیں آتی ـــــ وفاداری، اعتماد، خوف، محبت، امید وغیرہ کا اندرونی جذبہ اپنے اظہار کے لیے خود ایک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بس یہی ہے وہ چیز جو اگر عبودیت و بندگی کے اظہار کے ساتھ ہو تو اسے مناسک اور فقہا کی اصطلاح میں عبادات کہتے ہیں۔ یہ چند مراسم پرستش ہوتے ہیں جو بے ساختہ بھی ہو سکتے ہیں اور کسی قدر تکلف و آورد کے ساتھ بھی۔ یہ نفس شئے عین فطرتِ انسانی ہے۔ رہے اظہار کے طریقے تو وہ "فطرتِ عقل" کے مطابق ہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

عقائد و عبادات پر بحث اس وقت پیشِ نظر نہیں۔ صرف ربطِ مابعد کے لیے چند اشارے کر دیے گئے ہیں۔ اس سے آگے اخلاق و معاملات ہیں۔ ان دونوں پر بھی بہ تمام و کمال بحث اس وقت ممکن نہیں اور نہ ہر ہر پہلو کو ایک ہی صحبت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس موقعے پر صرف چند مثالیں پیش کریں گے جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ان کے تجزیہ و تحلیل میں بھی قرآن نے فطرتِ انسانی ہی کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اسلام اپنے اس حصے کے لحاظ سے بھی عین دینِ فطرت ہی ہے۔

ان تشریحات میں قدم رکھنے سے پہلے یہ خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اخلاق اور معاملات دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اخلاق ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ معاملات درست و راست ہوں اور معاملات کی راستی و درستی اخلاق ہی کا مظہر ہوتی ہے۔ اخلاق کا تنہا انسان کی اپنی ذات سے تعلق نہیں۔ انسان ہزار خلوت پسند ہو لیکن ضروریاتِ زندگی اسے کسی نہ کسی سے کوئی

ربط و تعلق پیدا کرنے پر مجبور کر ہی دیں گی اور جہاں اس کا کسی سے کسی قسم کا واسطہ پیدا ہوا اور اخلاق نے معاملات کی شکل اختیار کر لی کیونکہ اخلاق کے ظہور ہی کا دوسرا نام معاملات ہے۔ غرض ان دونوں اجزائے دین کو بالکل الگ کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا جو احکام اخلاق سے متعلق ہوں گے ان کا ظہور معاملات سے الگ نہیں ہوگا اور معاملات کے متعلق جو اوامر و نواہی ہوں گے وہ اخلاقی عناصر سے کبھی خالی نہیں ہوں گے۔ اس باہمی پیوستگی کے باوجود اخلاق و معاملات کے مزاج میں کچھ باریک سے فرق بھی ہیں۔ ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ احکام دونوں کے فطرت کے مطابق ہیں لیکن دونوں کی فطرتیں نوعیت کے اعتبار سے کسی قدر جداگانہ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جس نقطۂ نگاہ سے ایک اخلاقی حکم مطابقِ فطرت ہے اسی نقطۂ نگاہ سے کوئی معاملاتی حکم بھی عین فطرت ہو۔ یہ ہو سکتا ہے اور بہ کثرت اس کی مثالیں موجود ہیں کہ اخلاق اور معاملات کے تقاضے کسی وقت الگ الگ بھی ہو جائیں۔ سرسری نگاہ سے ان دونوں کا فرق یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے:

(۱) معاملات کا قانون سے گہرا تعلق ہے اور اخلاق قانون سے بلند تر چیز ہے۔

(۲) قانونِ معاملات اخلاق کی کمی کی وجہ سے بنتے ہیں لیکن قانونِ اخلاق معاملات کی کمی کے سبب سے نہیں بنتے۔

(۳) قانونِ معاملات اخلاق کی کمی بیشی سے بدلتے رہتے ہیں لیکن اخلاقی اقدار قریباً سب غیر متبدل ہوتے ہیں۔

(۴) قانونِ معاملات کی حکومت صرف ظواہر پر ہوتی ہے اور قانونِ اخلاق دل پر حکمرانی کرتا ہے۔

(۵) قانونِ معاملات کی اصل روح اخلاق ہی ہے اور اس کی قوتِ منفذہ بھی اخلاق ہی ہیں۔

(۶) اخلاق اصل بنیاد ہے اور معاملات اس کی فرع اور مظہر ہے۔

(۷) قانون ذریعہ ہوتا ہے انسانی شرارتوں کو روکنے کا اور اخلاق خلاق ہے انسانی شرافتوں کا۔

(۸) قانونِ معاملات فرار کی راہیں بھی پیدا کر دیتا ہے اور قانونِ اخلاق گریز کی راہیں بند کرتا ہے۔

(۹) ایک اچھی سوسائٹی کا صرف اخلاق سے بننا تو ممکن ہے لیکن صرف قانونِ معاملات سے

بننا تقریباً محال ہے۔

(۱۰) اخلاق کو ابتدائی فطری چیز ہونے کی وجہ سے اولیت و تقدم حاصل ہے اور معاملات اس لحاظ سے مؤخر ہے۔

(۱۱) معاملات کا تعلق "عقل" سے ہے اور اخلاق "کا عشق سے۔

فرض کیجیے آپ کہیں جا رہے ہیں اور کسی ویرانے میں آپ کو ایک اپاہج متعدی جلدی امراض کا مارا خون اور پیپ سے آلودہ ملتا ہے۔ عقل جو معاملات کے قانون پر حاوی ہے یہ کہے گی کہ میری خدمت سے یہ بچ تو سکتا نہیں، میرا فلاں ضروری کام قومی خدمت سے تعلق رکھتا ہے اسے مؤخر نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اس کی خدمت کی جائے تو کوئی دیکھ کر نصیحت لینے والا بھی نہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو کوئی ملامت کرنے والا بھی موجود نہیں علاوہ ازیں یہ متعدی مرض اگر مجھے لگ گیا تو میں بھی مارا جاؤں گا اور خدا جانے کتنوں کو میرا مرض لگ جائے ـــــ غرض عقل ہزار طرح کے حیلے تراش لے گی اور وہ اپنے اندر ہی اندر اپنا "معاملہ" صاف کر لے گا۔ لیکن انسانیت کا عشق جو جان ہے اخلاق کی اسے کچھ دوسرے سلوک پر آمادہ کرے گا ـــــ ہو سکتا ہے کہ یہ مثال سو فیصد فٹ نہ آئے اور عقل اس عشق کو بے وقوف بنا کر کچھ شاندار توجیہات بھی پیش کر دے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ بعض اوقات دونوں کے تقاضوں میں باہمی کشمکش ہو جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات اور اخلاق ایک دوسرے میں مدغم ہونے کے باوجود اپنی انفرادی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے دونوں کے احکام جداگانہ حیثیتوں سے بھی فطرت سے مطابقت رکھتے ہوں گے اور متحدہ فطرت سے بھی۔

مختصراً ہم دونوں کی فطرتوں کی مطابقت کو یوں ظاہر کر سکتے ہیں کہ معاملات کے متعلق جو احکام دیے گئے ہیں وہ "فطرتِ عقل" کے مطابق ہیں اور جتنے اخلاقی احکام ہیں وہ "فطرتِ وجدان" کے مطابق ہیں اور یہ دونوں فطرتیں انسان کے اندر موجود ہیں۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ جس طرح کائنات میں ہر ایک شے کی ایک فطرت ہوتی ہے

اسی طرح "عقلِ انسانی" کی بھی ایک فطرت ہے۔ یہ فطرتِ عقل کیا ہے؟ ارتقا، دریافت، مجہول سے معلوم کو حاصل کرنا اور ایک صحیح نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہونا۔ اس مقصد کے لیے عقل ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتی ہے۔ جس علم و فن کا مسئلہ ہوگا اس کی گہرائیوں میں اتر کر تہہ تک پہنچے گی اور حقیقت کا پتہ چلائے گی۔ عقل ایک بہت بڑے عاقل کی ہو یا بہت سے عقلا کی۔ ایک زمانے کے عقلا کی ہو یا بہت سے ادوار کے عقلا کی ہو۔ اس کا کام ہے ٹھیک ٹھیک نتیجے پر پہنچنا۔ مسئلہ جتنا سادہ ہوگا اتنا کم وقت لے گی اور جتنا دقیق ہوگا اتنی دیر لگائے گی۔ کتنے مسائل ہیں جن کا پہلے کوئی صحیح تصور بھی موجود نہ تھا۔ لیکن صدیوں کی مشاہداتی اور تجرباتی کاوشوں کے بعد آج عقل اس کی حقیقت کو پا گئی اور اسی طرح آگے ارتقا پر ارتقا کرتی جائے گی۔ بیسیوں حقائق ایسے ہیں جو دو اور دو چار کی طرح معلوم کرنے میں عقلِ انسانی نے بہت قلیل عرصہ لیا۔

کہنا یہ ہے کہ معاملات میں اسلام نے انسان کی جو راہنمائی کی ہے اس کے تمام اجزا "فطرتِ عقل" کے مطابق ہیں۔ بعض حقیقتوں کو عقل بڑی حد تک پا چکی ہے اور بعض احکام ایسے ہیں کہ عقل گر پڑ کر آخر کار اسی مقام پر پہنچے گی جہاں قرآن کی وحی صدیوں پہلے پہنچ چکی ہے۔ معاملات کوئی ایسی مابعد الطبیعی قسم کی چیز نہیں جس کی تہہ تک پہنچنے میں صدیاں درکار ہوں اور پھر بھی عقلی رسائی مشکوک ہی رہے۔ معاملات روشن حقیقتیں ہیں اور فطرتِ عقل ان کی کنہ تک جلد پہنچ سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر دور کی عقل کی ایک خاص پہنچ ہوتی ہے اور وہ وہیں تک پرواز کر سکتی ہے لیکن اسلامی قانونِ معاملات کا یہ اعجاز ہے کہ جب کسی دور کی عقل پچھلے دور کی عقل سے آگے بڑھے گی تو اس وقت بھی اس کی پرواز اسلامی قانونِ معاملات ہی تک ہوگی۔ آج وہ اسے معاشرتی نقطۂ نگاہ سے سو فیصد درست سمجھے گی تو کل اقتصادی زاویۂ نظر سے بھی اسی طرح ٹھیک جانے گی۔ پھر دیگر ادوارِ عقل میں وہ نفسیاتی معیار سے جانچ کر بھی اسی نتیجے پر پہنچے گی اور اخلاقی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اسی

مقام پہنچنے کی سعادت حاصل کرے گی ـــــ مزید برآں جس علم وفن میں جتنی ترقی ہوتی جائے گی۔ اتنی ہی اصل حقیقت روشن سے روشن تر ہوتی جائے گی۔ غرض ہر دور میں ہر لحاظ سے فطرت عقل سے ہم آہنگ ہوتی چلی جائے گی۔

اسی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو بھی سمجھنا چاہیے۔ بلاشبہ یہ شعبۂ دین بھی فطرتِ عقل ہی کے مطابق ہے لیکن اور مزید لطافت کے ساتھ اور کسی قدر عقل کی قانونیت سے بلند تر ہو کر۔ ہم ایسا کیوں کہہ رہے ہیں اس کی وجہ ان نمبروں میں گزر چکی ہے جہاں ہم نے قانونِ معاملات اور قانونِ اخلاق کا فرق بتایا ہے۔ معاملات اگر قانون کی شکل اختیار کر لیں تو زیادہ کامیاب نہیں رہتے اگر ان پر اخلاق کا غلبہ ہو تو وہ قانونیت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ "پڑوسی سے ہمدردی کرو" اس چھوٹے مگر وسیع المعنی الفاظ کو آپ قانون کا جامہ پہنا کر اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے اس لیے کہ ہمدردی ایک ایسا شریفانہ جذبہ ہے جو قانون سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ اگر قانون ظاہری پابندی کرو ابھی لے تو اس میں دس رخنے نکل سکتے ہیں اور دس راہ ہائے فرار پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدردی تو دل سے ابھرنے والا ایک جذبہ ہے اور دل پر قانون کی گرفت کبھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہی الفاظ "پڑوسی سے ہمدردی کرو" اگر اخلاق کا جامہ پہن لیں تو کسی قانونی دباؤ یا سیاسی نگرانی کے بغیر ہی حسن وخوبی کے مقصد حاصل ہو گا ـــــ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو فطرتِ عقل سے بالاتر فطرت کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ اسے آپ وجدانِ عقلی کہیے یا فطرتِ سلیمہ نام دے لیجیے، بہرحال یہ اسی فطرت کے مطابق ہیں۔

ہم پہلے معاملات کی چند مثالیں پیش کریں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ اخلاق کی مثالیں دیں گے۔

معاملات کا تعلق ہی دوسروں سے ہوتا ہے اور اپنے بال بچوں سے شروع ہو کر سارے عالم میں پھیل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرۃً اس کے بہت سے شعبے ہو گئے ہیں۔ مثلاً:

عائلی معاملات

خاندانی معاملات

قومی معاملات

ملکی معاملات

سیاسی یا بین الاقوامی معاملات

معاشی یا اقتصادی معاملات

معیشی معاملات

عدالتی معاملات

یہ سب کے سب عمرانی (سوشل) زندگی کے شعبے ہیں اور اسی کا حسن وجمال مقصود ہے تمام قوانینِ معاملات کے ذریعے۔ لیکن یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اسلام کا کوئی سوشل قانون نِرا قانونِ معاملات نہیں۔ معاملات کے متعلق شاید کوئی ایسا قانون نہ ہوگا جو قانونِ اخلاق کے غالب عنصر سے خالی ہو۔ تمام قوانینِ معاملات کی بنیاد اخلاق ہی پر رکھی گئی ہے۔ لہذا جہاں ہم اس باب میں کوئی بات فطرتِ عقل کی مطابقت میں دکھائیں گے وہاں عقلِ لطیف، یا وجدانِ صحیح یا فطرتِ سلیمہ کی مطابقت کی طرف بھی اشارہ کرتے جائیں گے۔

مشہور ہے کہ انسان فطرۃً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ مدنیت سے مراد اگر شہریت نہ لی جائے تو یہ قول اس لحاظ سے بالکل صحیح ہے کہ انسان فطرۃً سوشل اور عمرانی الطبع واقع ہوا ہے۔ اجتماعیت ایک ایسی فطرتِ انسانی ہے جس کے بغیر انسانی زندگی وبقا محال ہے۔ انسان کے وجود میں آتے ہی اسے چند ایسے انیس ملتے ہیں جن کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ انیس والدین ہیں یا دوسرے مربی جو پال پوس کر اس کی حیات کو برقرار رکھتے ہیں۔ پھر جوں جوں وہ اپنی عمر میں ترقی کرتا جاتا ہے اسے مزید انسانوں سے واسطہ پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے۔ تحفظِ ذات کے چند تقاضے فطرۃً اس کے پیچھے لگے ہوتے ہیں۔ تحکمی،

جنسی اور حفظی تقاضے بغیر دوسرے انسانوں کے تعاون کے کس طرح پورے ہو سکتے ہیں؟ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ تعاون کا یہ تعلق سارے جہاں سے ظاہراً و باطناً یکساں نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگوں سے اسے بار بار واسطہ پڑے گا اور بعض سے کبھی کبھی۔ کسی سے براہِ راست اور کسی سے بالواسطہ یا بالوسائط۔ کسی سے قلبی تعلق اور دلی انس ہوگا اور کسی سے نہیں۔ کسی سے نفرت و عناد کا تعلق ہوگا اور کسی سے محبت و خلوص کا۔ اسے اگر سوسائٹی میں رہنا ہے ـــــ اور اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ـــــ تو اسے سب سے نباہ کرنا پڑے گا۔ اور اگر وہ امن، حسن، خوشی کے ساتھ یہ نباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ وہ اور اس کے دوسرے اہل تعاون ایک ایسے معتدل و متوازن اصولِ زندگی کے پابند ہوں جو فطرتِ اجتماعیت سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو اور پوری سوسائٹی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہو۔ یہی بنیاد ہے عمرانی اصولِ حیات کی۔

اگر ہم غور کریں تو اس سوشل زندگی کا اصل نقطۂ آغاز عائلی زندگی ہے جہاں پوری اجتماعی زندگی سمٹ کر ایک مختصر سی چہار دیواری میں آجاتی ہے اور یہی پھیل کر ساری کائنات کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے۔ یہاں صرف نبھانے کے کچھ ظاہری اصول ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے اندر ایک روح بھی ہوتی ہے۔ صرف دماغ کام نہیں کرتا، دل بھی ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ فقط ہاتھ پاؤں اور زبان ہی حرکت میں نہیں آتے بلکہ اخلاص، محبت، بے لوثی اور ایثار کے اعلیٰ جذبات بھی ساتھ ساتھ لپٹے ہوتے ہیں۔ یہاں صرف معاملات نہیں ہوتے بلکہ اخلاق کے اعلیٰ صفات نمایاں طور پر غالب ہوتے ہیں۔ غرض گھریلو اور عائلی زندگی ہی عمرانیت کی خشتِ اوّل ہے۔

اس عائلی زندگی میں بنیادی حیثیت زوجین کو حاصل ہے اور ان ہی کی فرع ہے اولاد۔ یہی اولاد در اولاد پھیل کر ایک وسیع خاندان بنتا ہے۔ پورے کرۂ ارض میں انسانوں کی آبادی اسی طرح پھیلی ہے۔ اس لیے عائلی زندگی کو سوسائٹی میں بڑی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام نے اسی وجہ سے اسے خاص اہمیت دی ہے۔ قرآن پاک میں ایک پوری لمبی سورت سورۂ نساء

ان ہی عائلی پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے نازل فرمائی ہے۔ پھر بار بار اس مسئلے کی طرف مختلف مقامات پر توجہ دلائی ہے کیونکہ اسی کی درستی پر بیرونی سوشل زندگی کی درستی موقوف ہے۔ ہم بھی اسی بیان سے اس باب کا آغاز کرتے ہیں۔

عائلی زندگی کے قوانین

ازدواجی زندگی سے عائلی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اور ازدواجی زندگی کی ابتدا جس مرحلے سے شروع ہوتی ہے اس کا نام دینی اصطلاح میں نکاح ہے۔ نکاح دراصل ایک معاہدہ ہے مرد و زن کے درمیان، ایک الگ گھر بسا کر علاحدہ خاندان کی بنیاد ڈالنے کے لیے۔ فطرت نے ان دونوں ایجابی و سلبی تاروں کے اتصال میں ایسی برقی کشش رکھی ہے جو ناقابلِ شکست ہے اور ناقابلِ انکار۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے اس نے تجرد کی کہیں حمایت نہیں کی ہے۔ تجرد فطرت کے خلاف ہے اس لیے اسلام کے تمام احکام اس بارے میں تائیدِ نکاح ہی میں ہیں۔ مثلاً:

(۱) وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ط ان یکونوا فقراء یغنیھم اللہ من فضلہ۔

یعنی تم خود مختار ہو اور تمہارے زیر دستوں میں جو لوگ مجرد ہیں اور نکاح کے قابل ہیں ان کا نکاح کرا دو۔ اگر وہ محتاج بھی ہوں گے تو اللہ انھیں غنی کر دے گا۔

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔ اولاً یہ کہ صاحبِ حیثیت لوگوں کا صرف اتنا ہی فرض نہیں کہ خود نکاح کا ثواب حاصل کر کے بیٹھ جائیں بلکہ ان کا سوشل فرض ہے کہ ان کی اولاد میں، کنبے میں، نوکروں چاکروں میں جو مرد و زن صالح (قابلِ ازدواج) ہوں ان کا نکاح کرانے میں بھی اپنے نکاح کی طرح دلچسپی و کوشش سے کام لیں۔ ثانیاً یہ کہ معاشی تنگی کا خوف اس فرض کو انجام دینے میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ بعد از نکاح ذمے داریوں کا فطری احساس خود انھیں بفضلِ الٰہی غنی کر دے گا۔

(۲) النکاح سنتی ومن رغب عن سنتی فلیس منی (حدیث) نکاح میرا طریقہ ہے، جو اس سے منہ موڑتا ہے وہ میرے حلقے سے باہر ہے۔

(۳) من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج (رواہ الستۃ الامالکاً) تم میں جو نکاح کر سکتا ہو وہ ضرور شادی کرے کیونکہ یہ نگاہوں اور شرمگاہ کو محفوظ رکھنے کے لیے سب سے بہتر ذریعہ ہے۔

(۴) من تزوج فقد استکمل نصف الایمان فلیتق اللہ فی النصف الباقی (اوسط) شادی کرنے والا نصف ایمان کی تکمیل کرتا ہے۔ باقی نصف میں وہ تقویٰ اللہ کو اپنا شعار بنائے۔

یہ عام احکام نکاح کے عمومی حکم کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن اسے نہ بھولنا چاہیے کہ بعض انفرادی صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جب کسی فرد خاص کے لیے نکاح کا نہ کرنا ہی بہتر یا ضروری ہو۔

ظاہری کشش شوہر یا بیوی میں مفقود ہو۔

یا جنسی قوت سے عاری ہو۔

یا مرد کفالت کی صلاحیت سے یا عورت اپنے فرائض ادا کرنے سے یکسر قاصر ہو۔

یا فی الواقع کوئی قومی شدید ضرورت کے لیے زندگی کو وقف کر دے اور ازدواجی زندگی اس میں حائل ہو اور وہ بآسانی اس تجرد کو برداشت کر سکے۔

غرض ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جہاں نکاح سے انسان دستکش رہے لیکن یہ انفرادی حکم ہوگا، عام اصول وہی ہوگا جو ترغیبات نکاح میں بیان کیا گیا ہے

نکاح کی اصل الاصول بحد ارزن و مرد کا ذاتی باہمی سمجھوتہ ہے جو دونوں کے اپنے اپنے حقوق و فرائض پر مشتمل ہے۔ لیکن اتنا بھر سمجھوتہ تو دنیا کے تمام حیوانات بھی کر لیتے ہیں۔ انسان کے اس باہمی سمجھوتے میں کچھ مزید شرائط بھی شامل ہیں۔ مثلاً

سمجھدار اولیا کی مفاہمت و موافقت

کم از کم دو گواہوں کی موجودگی
کفالت کا لحاظ
مال مہر کی ادائیگی
زوجین کا اقرار (بطریق ایجاب وقبول)

ان چیزوں کی تفصیلات میں جانا مقصود نہیں۔ کتب فقہ میں ان سب کی تفصیلات و ماخذ موجود ہیں۔ سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ:

زوجین کو اپنے فرائض کا احساس رہے
صنف لطیف کی ضروری رعایتیں پیش نظر رہیں
فساد انگیز اختلافات نہ پیدا ہونے پائیں

اس طرح کی حیوانی آزادی نہ پیدا ہو جو اپنی پسند کے آگے تمام سوسائٹی کی پسند کو ختم کر دینے کا جذبہ پیدا کرے

دونوں کے حسن معاشرت کا امکان زیادہ سے زیادہ پیدا ہو۔

ان مقاصد کی روح کو باقی رکھتے ہوئے بعض شرطوں میں ناگزیر ترمیم کی بھی اجازت ہے۔ مثلاً اگر عورت پوری طرح ذی فہم ہے اور اپنے معاملات کو اپنے اولیا سے بہتر سمجھتی ہے خواہ بسبب تشیع (نزد ابوحنیفہؒ) یا بہ سبب بلوغ (نزد شافعیؒ) تو اس کے اپنے انتخاب کو اولیا کی رائے پر ترجیح ہوگی۔ اگر بناہ کی خوشگواری متوقع ہو تو خاندان یا پیشے کی کفارت نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ اگر مال مہر موجود نہ ہو تو کسی غیر مالی صلاحیت کو بھی مہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر زوجین زبان یا قلم سے اقرار کرنے کے قابل نہ ہوں (مثلاً گونگے) تو محض اشارے کا اقرار بھی کافی ہے۔ ان تمام باتوں سے آپ اسی نتیجے پر پہنچیں گے قوانین و شرائط نکاح اپنی ایک خاص روح رکھتے ہیں جن کو مختصراً اوپر بیان کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ فطرت عقل کے عین مطابق ہے۔

نکاح کے بعد ہی زوجین ایک نئے دور زندگی میں قدم رکھتے ہیں۔ نکاح کا ہو جانا کوئی مشکل

کام نہیں۔ اس کے متعلق جو ترغیبات ہیں اور جن کا کچھ ذکر اوپر آچکا ہے وہ اس لیے نہیں ہیں کہ دنیا اس سے بھاگتی ہے۔ جہاں تک زن و مرد کے اتصال کا تعلق ہے وہ ایک ناقابلِ انکار فطرت ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کسی ترغیب کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ ترغیبات تو صرف اس لیے ہیں کہ جو لوگ زن و مرد کے وجود کو محض تسکین جنسی کا ذریعہ سمجھتے ہیں یا محض افزائش نسل کا بہانہ تصور کرتے ہیں وہ اسے ایک اعلیٰ اخلاقی فرض سمجھ کر اس کی اصل ذمے واریوں کا احساس کرلیں اور دوسری طرف جو لوگ اسے خلافِ تقویٰ چیز سمجھتے ہیں اور تجرد کی غیر فطری زندگی کو ایک مقدس فعل تصور کرتے ہیں وہ اسی کو عین تقویٰ کی زندگی بنائیں اور سمجھیں۔ غرض دونوں افراط و تفریط کے درمیان اگر کوئی نقطۂ اعتدال اور مرکزِ توازن ہے تو وہ صرف نکاح ہے ـــــ اسلامی نکاح ـــــ آپ خود سوچیے تقویٰ، نسل پروری، ہمدردی و تعاون، اور ذمے دارانہ زندگی کے اعلیٰ و شریفانہ احساسات کبھی ایسے شخص میں پیدا ہو سکتے ہیں جو اس قانونی و روحانی معاہدے (نکاح) کے بغیر صرف تسکین ہوس کے لیے جہاں دل چاہتا ہو چلا جاتا ہو؟ اور کیا وہ شخص فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے جو بلاوجہ معقول تجرد کو پسند کیے ہوئے ہے درانحالیکہ حیوانات و نباتات ہی نہیں بلکہ اب جمادات تک میں نر و مادہ کا فلسفہ اور فاعل و منفعل کا وجود مسلّم ہو گیا ہے؟

ہر کیف کہنا یہ ہے کہ ترغیباتِ نکاح اس لیے نہیں کہ دنیا اس فطری اتصال سے بھاگتی ہے۔ بلکہ اس کے وجوہ دوسرے ہیں جو ابھی بیان کیے گئے ہیں۔ محض اتصال کی رغبت دلانے کے لیے بہت کم احکام دیے گئے ہیں اس لیے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں۔ جو اصل احکام ہیں وہ وہ ہیں جو مابعد النکاح کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نکاح کے بعد ہی زندگی ایک نئے دائرے میں قدم رکھتی ہے جو انسانی کردار کی امتحان گاہ ہے۔ احکام کی ضرورت اسی حصۂ عمر کے لیے ہے اور اسلام نے اسے بہ تمام و کمال بیان کر دیا ہے اور اس کا ایک ایک جز عین فطرت و عقل کے مطابق ہے۔

اسی مقام سے معاشرۃ النساء کا باب شروع ہوتا ہے جو معاشرۂ عامہ اور سوشل زندگی

کا مقیاس ہے۔ اس بارے میں اسلام کے جو احکام ہیں ان کو جاننے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ کون سے فطری حقائق ہیں جو یہ ہدایات دینے میں اسلام کے پیش نظر ہیں۔ اگر آپ رجالی اور نسائی فطرتوں کا مطالعہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کچھ باتیں دونوں میں مشترک ہیں اور کچھ باتیں ایسی ہیں جہاں دونوں کے فطری تقاضے الگ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

فعل و انفعال کا فرق مرد و زن میں ایک مسلّم فطری حقیقت ہے

جسمانی ساخت کی طرح جسمانی قوت و ضعف اور صلابت و نزاکت کا فرق بھی کوئی دقیق نکتہ نہیں۔

دماغی اعتبار سے بھی دونوں کا تثقل و خفت سائنس کی مسلّمہ حقیقت ہے۔

مزاجی و عقلی لحاظ سے بھی دونوں کی پختگی و خامی کوئی پوشیدہ راز نہیں

والدہ (جننے والی) اور مولودلہٗ (جس پر مولود کی کفالت کی ذمے داری ہے) کے فرق سے کون انکار کر سکتا ہے؟

شدائد (خواہ جنگی ہوں یا کاروباری) کی برداشت کی صلاحیتوں کا فرق کسے نہیں معلوم؟

دونوں کی پسند و انتخاب کے فرق سے کون ناواقف ہے؟

ان تمام فروق کو سامنے رکھنے کے بعد یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ فطرت نے خود دونوں کی فطرتوں اور صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں کے دوائرِ عمل کا تعیّن ان ہی فطری صلاحیتوں کی بنیاد پر کیا جائے۔ عورت اپنی رائے، عقل، مزاج، پسند ظاہری و باطنی ساخت کے اعتبار سے ایک کڑی (Link) ہے صاحبِ عقل مرد اور بے عقل بچے کے درمیان۔ کبھی وہ اس سطح پر ہوتی ہے اور کبھی اس سطح پر۔ اسے بچہ سمجھ کر کاندھوں پر اٹھائے پھرنا بھی غلط ہے اور نبرد آزما پہلوان تصور کر کے شدائد ایام کے سامنے سینہ سپر کرنا بھی غلط ہے۔ اگر بڑے اور بچے کے دوائرِ عمل جدا جدا ہیں تو عورت و مرد کے حلقہائے فرائض بھی یقیناً الگ الگ ہیں۔ یہ کہیں مردوں کے ہم دوش بھی ہو گی اور کہیں جداگانہ بھی۔

یہ صحیح ہے کہ "نہ ہر زن زن است و نہ مرد مرد" لیکن یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ قواعد و اصول ہمیشہ اکثری ہوا کرتے ہیں۔ استثناء اپنا کلیہ بنایا نہیں کرتے بلکہ دوسرے کلیات کو ثابت کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ مقولہ (مصرعہ) خود ہی اندر سے دونوں کے فرق کو بتا رہا ہے۔

نہایت ظلم ہوگا اگر قانونِ معاشرت میں ان فطرت کے فرقوں کو نظر انداز کر دیا جائے یا ضعیف کو قوی کے مقابلے میں رعایتیں نہ دی جائیں۔ فطرت خود اقویٰ کے مقابلے میں قوی کی اور ضعیف کے مقابلے میں اضعف کی رعایت کرتی ہے اور دینِ فطرت وہی ہوگا جو فطرت کے اس اصولِ دستگیری سے ہم آہنگ ہو۔ پچھلے صفحے میں یہ مثال کہیں گزر چکی ہے کہ انسان کو کسب و محنت سے کما کر روٹی ہانڈی کے جھگڑے کرنے پڑتے ہیں۔ چڑیا اڑ کر کہیں سے صرف دانا چگ لیتی ہے اور درخت کو وہیں کھڑے کھڑے غذا مل جاتی ہے۔ اگر بڑے کے مقابلے میں بچہ ہر عقل و فطرت کے نزدیک زیادہ مستحقِ رعایت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ رعایت کی حقدار نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانونِ نکاح و معاشرت میں

مہر عورت کو دلوایا گیا ہے مرد کو نہیں

روٹی کپڑے کے علاوہ تمام ضروریاتِ زندگی کی کفالت کا بوجھ مرد کے سر ڈالا گیا ہے

حسنِ معاشرت کے تقریباً تمام احکام مرد کو دیے گئے ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

جہاں آپ نے فطرت کا قانونِ رعایت و دستگیری دیکھا وہیں اس کا قانونِ تفوق بھی دیکھتے چلیے۔ قدرت کا یہ بھی قانون ہے کہ جسے جتنی کم رعایت ملتی ہے اتنا ہی اس کا درجہ بڑا ہوتا ہے۔ اگر نباتات سے پرندے کا اور پرندے سے انسان کا درجہ بڑا ہے اور اگر اسی اصولِ رعایت کی رو سے عورت (ماں) کا درجہ بچے پر فائق ہے تو یقیناً اس عورت پر جسے رعایتیں دی گئی ہیں اس مرد کو کچھ تفوق ہونا چاہیے جسے یہ رعایتیں نہیں دی گئیں بلکہ حفاظت، کفالت کا ذمے دار اور حسنِ معاملت و معاشرت کے احکام کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ بس یہی ہے وہ فطری قانونِ رعایت و قانونِ تفوق جسے قرآن نے چند لفظوں میں یوں ظاہر کیا ہے کہ:

"الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضکم علی بعض و بما انفقوا من اموالہم ۳۴" ۔ مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں ۔ فطری فضیلت کی وجہ سے بھی اور انفاقِ مال کے سبب سے بھی ۔ اور "وللرجال علیہن درجۃ" ۔ عورتوں پر مردکو معمولی سا فطری تفوق حاصل ہے ۔

پہلے ٹکڑے میں مردوں کو ذمے دار بنا کر عورتوں کے لیے قانونِ رعایت کا ذکر ہے اور دوسرے ٹکڑے میں مردوں کے لیے بوجہ عدمِ رعایت یا بسبب ذمہ داری کفالت فطری تفوق کا بیان ہے ۔ لیکن یہ مغالطہ ہو سکتا تھا کہ شاید یہ تفوق ویسا ہی نہ ہو جیسا ایک جنس کو دوسری جنس پر یا ایک نوع کو دوسری نوع پر ہوتا ہے اس لیے "وللرجال علیہن درجۃ" کہنے سے پہلے ہی یہ بتا دیا کہ "ولہن مثل الذی علیہن" ۔ تمہارے اور ان کے حقوق یکساں ہیں ۔ جیسے حقوق ان پر تمہارے ہیں ویسے ہی تم پر ان کے ہیں ۔

قانونِ وراثت اور فطرت

فطری قانونِ رعایت اور قانونِ تفوق کا ذکر آگیا ہے تو لگے ہاتھوں ایک چیز اور بھی سن لیجیے ۔ بعض اوقات یہ شک ہوتا ہے یا پیدا کیا جاتا ہے کہ قانونِ وراثت میں رعایت بھی مردوں کے لیے ہے اور تفوق بھی ان ہی کو حاصل ہے ۔ تفوق تو اس لیے کہ "للرجال علیہن درجۃ" اور رعایت یوں کہ ہر جگہ مردوں کو عورتوں سے دوگنا حصہ دلایا گیا ہے ۔ باپ کو ماں سے ، شوہر کو بیوی سے ، بھائی کو بہن سے اور فرزند کو دختر سے غرض ہر مرد کو اس کے مقابل کی عورت سے دوگنا حصہ دلوایا گیا ہے ۔ بہ ظاہر بات ایسی ہی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت بالکل برعکس ہے ۔ اگر ہم ایک سائل کو دو روپے دیں اور دوسرے کو صرف ایک روپیہ دیں اور ساتھ دو روپے کا آٹا بھی دیدیں تو جس کی نظر صرف روپے پر ہے اس کے نزدیک تو پہلا سائل زیادہ نفع میں رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسرا سائل زیادہ لے گیا ، اس لیے کہ اسے روپیہ اگرچہ ایک ہی ملا لیکن دوسرے طریقے سے نہ فقط کمی کی تلافی ہی کر دی گئی بلکہ پہلے سائل سے زیادہ دیا گیا ۔ بالکل یہی شکل وراثت کے قانون میں ہے ۔ عورت کو بہ ظاہر تو مرد سے آدھا حصہ

ملتا ہے لیکن دوسرے طریقوں سے صرف وہ کمی ہی نہیں پوری کی جاتی بلکہ اس سے دو چند زیادہ دلوا دیا جاتا ہے۔ فرض کیجیے زید اور خالدہ دو بھائی بہن ہیں، دونوں شادی شدہ ہیں اور دونوں کے تین تین بچے بھی ہیں۔ مورث تیس ہزار روپے چھوڑ کر مرتا ہے تو زید کو بیس ہزار ملیں گے اور خالدہ کو دس ہزار۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھیے کہ زید پر اپنے بیوی بچوں کی بھی ذمّے داری ہے اور خالدہ پر بچوں کی بلکہ اپنی بھی کفالت کی کوئی ذمے داری نہیں۔ اس لحاظ سے زید کے بیس ہزار روپے پانچ آدمیوں پر تقسیم ہو جائیں گے جن میں خود زید، اس کی بیوی اور تین بچے ہیں۔ ان پانچوں پر تقسیم ہونے کے بعد زید کے حصے میں دراصل صرف چار ہزار آتے ہیں لیکن وہاں خالدہ اس دس ہزار کی تنہا مالک ہے اور اس میں کوئی شریک و سہیم نہیں۔ وہ اپنی خوشی سے ساری رقم بچوں پر خرچ کر دے اس سے بحث نہیں لیکن عند اللہ اس پر بچوں کی، شوہر کی حتیٰ کہ خود اپنی بھی کوئی کفالتی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ پس قانونِ وراثت میں بھی رعایت صنفِ ضعیف ہی کی ہے اور نتیجے میں فطرۃً قانونِ تفوق مرد کے حصے میں آئے گا۔

پس اسلام کا قانونِ رعایت اور قانونِ تفوق دونوں عین فطرت کے مطابق ہیں۔

اب آیئے چند وہ آئینِ معاشرت بھی دیکھ لیں جن کا مخاطب مرد ہی کو بنایا گیا ہے یہی ہیں وہ قوانین جو معاشرتِ زوجین کی جان ہیں اور فطرتِ انسانی اور فطرتِ عقلی کے عین مطابق ہیں۔

"وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا" ۱۹/۴ ..... یعنی عورتوں سے معروف کے مطابق برتاؤ کرو۔ اگر تمھیں ان سے نفرت ہو تو یہ سمجھ لو کہ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ تمھیں کسی چیز سے نفرت ہو اور اللہ تعالیٰ اسی میں بہت سی خیر پیدا فرما دے۔

"ولا تضاروھن لتضیقوا علیھن" ۶۵/۶ انھیں محض تنگ کرنے کی غرض سے انھیں ضرر

نہ پہنچاؤ۔[1]

—— "الا ان لکم علیٰ نسائکم حقا ولنسائکم علیکم حقا فحقکم علیہن ان لا یوطئن فرشکم من تکرھون ولا یاذن فی بیوتکم لمن تکرھون۔ الا وحقہن علیکم ان تحسنوا الیہن وکسوتہن وطعامہن" (ترمذی)

تمہاری عورتوں پر تمہارا اور تم پر اُن کا کچھ حق ہے۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو ایسے شخص سے نہ روندوائیں جسے تم ناپسند کرتے ہو بلکہ تمہارے گھروں میں بھی داخل ہونے کی اسے اجازت نہ دیں۔ اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے روٹی کپڑے کا بہتر سے بہتر خیال کرو۔

"المرأۃ کالضلع اذا استمتعت بہا استمتعت بہا وفیہا عوج واذا اقمتہا کسرتہا" عورت پسلی کی ٹیڑھی ہڈی ہے۔ اس سے کام لینا چاہو تو اسی کجی کے ساتھ کام لینا ہوگا۔ اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو ٹوٹ جائے گی۔

یہ اور اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جن میں فطری قانونِ رعایت و قانونِ تفوق منعکس ہو گئے ہیں اور وہ عین فطرتِ عقل کے بھی مطابق ہیں۔

طلاق

قانون اور اس کا منشا

قانون دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اصلی اور دوسرے عبوری۔ اصلی قانون ہم اسے کہتے ہیں جس کا منشا ہے اس کا باقی رہنا۔ عبوری قانون وہ ہے جو اصلی قانون تک پہنچانے کے لیے وسیلہ و ذریعہ بنے۔ اس کی کئی مثالیں اسلامی قانون میں موجود ہیں:

(۱) غلامی یعنی جنگی قیدیوں کے لیے قرآن نے کچھ ہدایات دی ہیں، لیکن یہ اس لیے نہیں

---

(۱) اس آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ محض تنگ کرنے کے لیے کوئی سوکن نہ لاؤ۔ "مضارۃ" کے معنی ضرت (سوکن) لانا بھی ہر عربی لغت میں موجود ہے۔

کہ دنیا میں غلامی باقی رہے۔ بلکہ اس لیے ہیں کہ اس طرح رفتہ رفتہ غلامی ختم ہو جائے

(۲) زکوٰۃ یعنی موجودہ فقہی صورت زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ مال نکالنے کا حکم اس لیے نہیں کہ چالیسویں حصے پر ہی معاملہ آکر رک جائے بلکہ انفاق کی ایسی متوازن عادت ہو جائے کہ "قل العفو" کی منزل تک پہنچ کر دم لے اور زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ رہے۔

(۳) تعزیرات وحدود کا قانون اس لیے نہیں کہ دنیا میں جرم ہوتا رہے اور سزائیں دے دے کر ثواب دارین حاصل کیا جاتا رہے بلکہ اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ دنیا سے جرم ختم ہو جائے اور کسی کو سزا دینے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

(۴) جنگ کے قوانین بھی اس لیے نہیں کہ ہمیشہ یہ زیر مشق رہیں بلکہ دنیا میں ایسا نظام امن قائم ہو جائے کہ ضرورت جنگ کا قصہ ہی تمام ہو جائے۔

ایسے ایسے بہت سے قوانین آپ کو ملیں گے جو محض وسیلہ و ذریعہ ہیں کسی منزل تک پہنچانے کا۔ وہ خود مقصود نہیں ہوتے۔ ان ہی کو ہم عبوری قانون کہتے ہیں۔ ان کا منشاء خود باقی رہنا نہیں ہوتا بلکہ ایک مقصد تک پہنچا کر خود ختم ہو جانا ان کا اصلی منشا ہے۔ ہم نے مثالوں میں صرف اشارات کیے ہیں ورنہ ان کی تشریح کے لیے علاحدہ تصانیف بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ قوانین اگرچہ خود باقی رہنے کو نہیں ہوتے لیکن ان کا وجود اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان کے بغیر آگے بڑھنا اور منزل مقصود پر پہنچنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ مقصود حاصل ہونے کے بعد بھی ان کا ختم ہونا اس طور پر نہیں ہوتا کہ پھر یہ کبھی زندہ نہ ہوں بلکہ یہ عملاً ختم ہوتے ہیں اور قانوناً گویا محفوظ رہتے ہیں کہ اگر سوسائٹی میں پھر کبھی دور الخطا طآئے تو یہ خوابیدہ قوانین پھر جاگ کر پرانے یا نئے روپ میں جلوہ گر ہوں اور اپنا کام کر کے پھر سو رہیں۔ اور یہی گردشی دور بار بار ہوتا رہے تا آنکہ انسانیت اس بلند مقام پر پہنچ جائے جہاں فی الواقع ان کی ضرورت لعاد نہ باقی رہے۔

ایسے عبوری قوانین مجبوراً ضروری ہوتے ہیں اور "قوانین طلاق" کو بھی ان ہی میں شمار کرنا

چاہیے۔ اصل قانون جیسا کہ اوپر لکھا گیا، جمع زوجین یعنی نکاحی تعلق ہے تفریق زوجین نہیں لیکن جس دور میں یہ قوانین نازل ہوئے یا نافذ کیے گئے اس دور میں جمع زوجین کی منزل کے حصول کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب انسانیت اپنے اصلی بلند مقام پر پہنچ جائے گی اور منشائے قانون پورا ہو جائے گا تو قوانین طلاق کی ضرورت نہ باقی رہے گی جیسا کہ عارضی طور پر انفرادی حیثیت سے اب بھی بہت جگہ باقی نہیں۔

غرض قانونِ نکاح کا منشا و رجحان "جمع" ہے لیکن قانونِ طلاق کا منشا و رجحان "تفریق" نہیں بلکہ تفریق کی روک ہے۔ یعنی صحیح شکل تو یہ ہے کہ طلاق کی نوبت ہی نہ آئے لیکن اگر کبھی یہ کرنا ہی پڑے تو اس ناگزیر علت کو کس انداز سے اختیار کیا جائے۔ یہی قانونِ طلاق ہے اور اس منشا و روح کو آپ خود بعض اسلامی احکام سے ہی بڑی آسانی کے ساتھ بھانپ سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) جس طرح نکاح کا حکم یا ترغیب ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا) اس طرح کی کوئی ترغیب یا حکم طلاق کے لیے موجود نہیں۔

(۲) حضرت زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو حضورؐ نے فرمایا "امسک علیک زوجک واتق اللہ"۔ اپنی زوجہ کو روکے رکھ اور اس مکروہ فعل سے پہلے خدا سے ڈر۔

(۳) حضورؐ نے فرمایا "ابغض الحلال عند اللہ الطلاق"۔ قانونی طور پر جتنی باتوں کی اجازت ہے ان میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

(۴) مہر کی ادائیگی کا بوجھ خود ایک کی روک ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

(الف) اگر طلاق ایسی حالت میں دی جائے کہ نہ مہر متعین ہوا نہ اسے ہاتھ لگایا ہو تو اسے اپنی بساط کے مطابق ایک جوڑا دینا ہوگا[۱] (۲/۲۳۶)

(ب) اگر مہر معین ہو چکا ہو اور ہاتھ نہ لگایا گیا ہو تو مہر معین کا نصف[۲] (۲/۲۳۷)

(ج) اگر مہر معین ہو چکا ہو اور ہاتھ بھی لگایا گیا ہو تو پورا مہر معین[۳] (۴/۲۴) اور اگر

اس کے علاوہ مال و دولت کا ڈھیر بھی دیدیا گیا ہو تو واپس نہ لیا جائے گا"[۱] (۲۳۶/۲)

(د) اگر مہر نہ معین ہوا ہو اور ہاتھ لگایا گیا ہو تو مہر مثل (فقہ اسلامی)۔

غرض ہر چہار صورت میں کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے اور یہ گویا ایک طرح کی مالی روک ہے طلاق سے

(۵) طریق طلاق کی تعلیم بھی ایک روک ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ

(الف) طلاق طُہر بلا وطی کی حالت میں دینی چاہیئے"[۲] (۶۵/۱) کیونکہ بحالتِ حیض نہ عورت کا مزاجی توازن درست رہتا ہے نہ مرد کی طبیعت میں ادھر میلان ہوتا ہے۔

(ب) ہر طُہر بلا وطی میں ایک طلاق دینی چاہیئے (حدیث)۔ گویا یہ تین ماہ کی مدت دونوں کو اپنا مستقبل اور اس کے نشیب و فراز کو سوچنے کا موقع دیتی ہے اور اس طویل مدتِ انتظار میں فطری میلانِ جنسی کے ذریعے اپنی طلاق کو عملاً رجعی بنا دینے کا قوی امکان ہے۔

(ج) دو گواہ بھی لانے چاہیئں"[۳] (۶۵ : ۲) گواہوں کے مہیا ہونے تک کی درمیانی مدت میں فوری تاثرِ غیض و غضب کے دب جانے کا جہاں امکان ہے وہاں بڑا قوی امکان یہ بھی ہے کہ آنے والے گواہ صرف شہادت ہی دینے نہ آئیں گے یقیناً اسے سمجھا بجھا کر رفع نزاع کا کوئی حل بھی تلاش کریں گے۔

(د) آخری طلاق تک زوجین کو ایک ہی گھر میں رہنا چاہیئے"[۴] (۶۵ : ۶) تاکہ اتصال کے مواقع زیادہ یقینی ہوں۔

(ہ) اس دوران میں بیوی کا نان نفقہ اور سکنیٰ مرد ہی کے ذمے رہے گا (۶۵ : ۶)

حواشی صفحہ گذشتہ و صفحہ ہذا۔ ۱ لا جناح علیکم ... علی المقتر قدرہ۔ ۲ و ان طلقتموھن ... ... فرضتم۔ ۳ فما استمتعتم ... فریضہ۔ ۴ و ان اردتم ... ... شیئا۔ ۵ و اذا طلقتم ... العدۃ۔ ۶ و اشہدوا ... منکم۔ ۷ ولا تخرجوھن ... مبینۃ ۸ اسکنوھن ... علیھن۔ ۹ و ان خفتم شقاق ... یوفق اللہ بینھما۔

(۶) ارادۂ طلاق سے پہلے ایک اور طریقہ بھی بتایا گیا ہے جو اس طلاقی تفریق کو ختم کرنے کی غرض سے ہے۔ "وہ یہ ہے کہ دونوں کے شقاق و تفریق کا خطرہ محسوس کرتے ہی دونوں زوجین کی طرف سے ایک ایک حکم آ کر باہمی موافقت کرانے کی کوشش کریں"(۱) (۴: ۳۵)

غرض اخلاقی، مالی، معاشرتی، نفسیاتی وغیرہ کے سب راستوں پر قدغن بٹھا دی گئی ہے اور ہر جگہ فطرتِ سلیمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ "قانونِ طلاق" میں اسلامی رجحان تفریق کی طرف نہیں بلکہ اس تفریق کو روکنے کی طرف ہے لیکن یہ ناگزیر تھے بعض اوقات اس لیے اختیار کرنی پڑتی ہے کہ انسانیت ابھی اس مقام تک نہیں پہنچی ہے جہاں اس قانون کی ضرورت ختم ہو جائے۔ اسی درمیانی فاصلے کو طے کرنے کے لیے بعض عبوری قوانین دیے جاتے ہیں اور قانونِ طلاق بھی اسی قسم کا ایک قانون ہے جس کی تمام جزئیات فطرت عقل کے عین مطابق ہیں۔

طلاق کی نزاکت اور راہِ اعتدال

طلاق کے بارے میں تین ہی راہیں ہو سکتی ہیں:

(۱) اسے بالکل عام کر دیا جائے

(۲) اسے بالکل ختم کر دیا جائے

(۳) اس پر کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں

پہلی راہ ایسی ہے جس کا نتیجہ فساد کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر اس میں پوری آزادی دے دی جائے تو ذرا ذرا سی بات پر اور معمولی معمولی جھگڑوں پر مرد طلاق دے کر زوجہ کو الگ کرنا شروع کر دے گا یا زوجہ اپنے شوہر سے مطالبۂ طلاق شروع کر دے گی (جسے خلع کہتے ہیں)، اس صورت

---

(۱) وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اہلہ وحکما من اہلھا ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما۔

(۴/۳۵)

میں نکاح کی روح یعنی "جمع" تفریق میں بدل جائے گی جو سوشل مقاصد کی نقیض ہے۔

دوسری شکل ایسی ہے کہ نتیجہ اس کا بھی فساد ہی ہے کیونکہ اگر زوجین کو یہ اطمینان ہو جائے کہ باہم جدائی کا کوئی امکان ہی نہیں تو وہ اپنی ہر بات، ہر خواہش اور ہر کام میں آزاد ہوں گے۔ نہ اطاعت رہے گی نہ شرافت، اور نہ حسنِ معاشرت۔ نہ بیوی کو یہ ڈر کہ شوہر ہمیں الگ کر دے گا اور نہ میاں کو یہ خطرہ بیوی علاحدگی کا مطالبہ کرے گی یہ یقینی بات ہے کہ صرف محبت و خلوص ہی سے دنیا میں کام نہیں چلتا۔ کچھ ڈر بھی ہونا چاہیے۔ اگر یہ ڈر ہی نکل جائے تو حسنِ معاشرت کا نظام ادھورا رہ جائے گا۔

ایک اور خرابی اس میں یہ بھی ہے کہ بعض مراحلِ زندگی ایسے بھی آتے ہیں جہاں زوجین کی تفریق ہی دونوں کے لیے عین رحمت ہوتی ہے۔ ایسے مرحلوں پر اگر طلاق کا وجود ہی نہ تسلیم کیا جائے تو دونوں کی زندگی جہنم کا نمونہ بن جائے گی۔ فرض کیجیے:

شوہر قوائے حیوانی سے عاری ہو جائے اور معالجہ ناکام ثابت ہو

یا سخت تند مزاج ہو

یا حقوقِ زوجہ نہ ادا کرتا ہو

یا ایسے ہی سخت عیوب بیوی میں ہوں

یا دونوں میں ہوں اور آپس کی منافرت لاعلاج حد تک پہنچ جائے

تو ظاہر ہے کہ ان حالات میں دونوں کا سکون تفریق میں ہوگا نہ کہ جمع میں۔ لیکن دوسری شکل یعنی طلاق کے وجود کو ہی ختم کر دینے میں وہ تفریق بھی ختم ہو جاتی ہے جو بعض حالات میں دونوں کے سکون کا ذریعہ ہے۔

اب صرف تیسری شکل رہ جاتی ہے یعنی طلاق کا ایک مؤثر وجود تسلیم کیا جائے لیکن اس پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جو غلط استعمال سے باز رکھیں۔ یہی طریقہ اسلام نے اختیار کیا ہے یعنی اس کے مؤثر وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایسی پابندیاں لگا دی ہیں جو اس کے غلط استعمال

سے باز رکھیں۔ اوپر ان ہی پابندیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

طلاق کی ایک فطری مثال

اسلام طلاق کو ایک سنکھیا سمجھتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ اس زہر کا کوئی وجود نہیں یا یہ بے حقیقت شے ہے۔ اور نہ یہ کہتا ہے کہ چونکہ یہ زہر ہے اس لیے اسے بے مصرف سمجھ کر پھینک دو بلکہ اس کی تمام تاثیرات کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے مقام اور علاج کو متعین کرتا ہے۔ دیکھیے سنکھیا کے اثرات پانچ طریقے سے ظاہر ہوتے ہیں اور بالکل یہی اثرات طلاق کے بھی ظہور میں آتے ہیں:

(۱) سنکھیا اگر کشتہ کر کے یا کسی اور حکیمانہ طریقے سے استعمال کیا جائے تو وہ تریاق کا کام کرتا ہے طلاق کا ایک اثر یہ بھی ہے۔ یعنی معاملہ ایسی حد پر پہنچ چکا ہو کہ طلاق کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو اور اسی میں دونوں کا بھلا ہو تو یہ مفارقت دونوں کے حق میں بہتر و مفید ہو گی اور تریاق کا کام دے گی۔ ہاں جس طرح سنکھیا کو کشتہ کرنے میں کچھ محنت اور تیاری کرنی پڑتی ہے اسی طرح اس طلاق کے لیے بھی ادائے مہر، انتظارِ طہر، اشہادِ شاہدین، بعثِ حکمین، یکجائی زوجین، بار نفقہ وغیرہ کے سامان کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد یہ طلاق دونوں کے حق میں تریاقی اثر پیدا کر دے گی۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں قرآن پاک فرماتا ہے کہ "وان یتفرقا یغن اللّٰہ کلا من سعتہ" ( )

یعنی اگر ایسی مجبوری کی حالت میں زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت و فضل سے دونوں کو ایک دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔

(۲) سنکھیا اگر بہت کم مقدار میں ہو تو بے اثر ہوتی ہے یعنی نہ اس سے کوئی خاص نقصان ہوتا ہے نہ خاص فائدہ۔ طلاق رجعی کی بالکل یہی صورت ہوتی ہے۔ یعنی تین قروء کی عدت گزرنے سے پہلے اگر کوئی شخص اپنی طلاق کو واپس لے لے تو اسی طرح نکاح باقی رہتا ہے۔

(۳) سنکھیا کی ایک مقدار ایسی بھی ہوتی ہے جو مضر تو ہوتی ہے مگر اس کی مضرت قابلِ علاج ہوتی ہے۔ طلاق کی ایک شکل یہ بھی ہے۔ یعنی اگر طلاق کے بعد عدت گزر جائے تو وہ طلاقِ بائنہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت نکاح ختم ہو جاتا ہے لیکن دونوں کے ملنے کا امکان باقی رہتا ہے۔ یعنی اگر

تجدید نکاح کر لی جائے تو پھر سابق نکاحی تعلق عود کر آتا ہے۔

(۴) سنکھیا کی ایک مقدار ایسی بھی ہے جس کا نتیجہ موت ہوتا ہے اور ایک شکل یہ بھی ہے طلاق کی۔ یعنی اگر تفریق کی شکل مغلظہ ہو اور نکاحی تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہو تو تجدید نکاح وغیرہ کر کے سابق تعلق قائم ہونے کی کوئی شکل نہیں۔

(۵) سنکھیا کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ہوتی تو ہے اتنی مقدار میں جو موت کے لیے کافی ہو لیکن محض قدرتِ خداوندی سے انسان بچ جاتا ہے اسے ہم سنکھیا کا اثر نہیں کہہ سکتے بلکہ قسمت کہہ سکتے ہیں۔ تاہم طلاق کے باب میں یہ قسم بھی موجود ہے۔ دائمی تفریق کی صورت میں عورت کوئی دوسرا نکاح کرے اور وہ دوسرا شوہر بھی اتفاقیہ طلاق دیدے یا مر جائے تو بعد از عدت پہلے شوہر سے پھر نکاح ہو سکتا ہے۔

اس پیش کردہ مثال پر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اسلام میں قانونِ طلاق عین فطرتِ عقل اور قانونِ اعتدال کی فطرت کے مطابق ہے۔ (باقی)

اجتہادی مسائل

مصنفہ مولانا شاہ محمد جعفر ندوی

شریعت نام ہے قانون کا جو ہر دور میں ایک نیا روپ دھارتا ہے اور دین اس کی وہ روح ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ ہر دور کے لیے اجتہاد اور بصیرت کی ضرورت ہے جس میں بہت سے مسائل کا از سرِ نو جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ایسے متعدد مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۵۰ر۴ روپے

ملنے کا پتہ: سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور